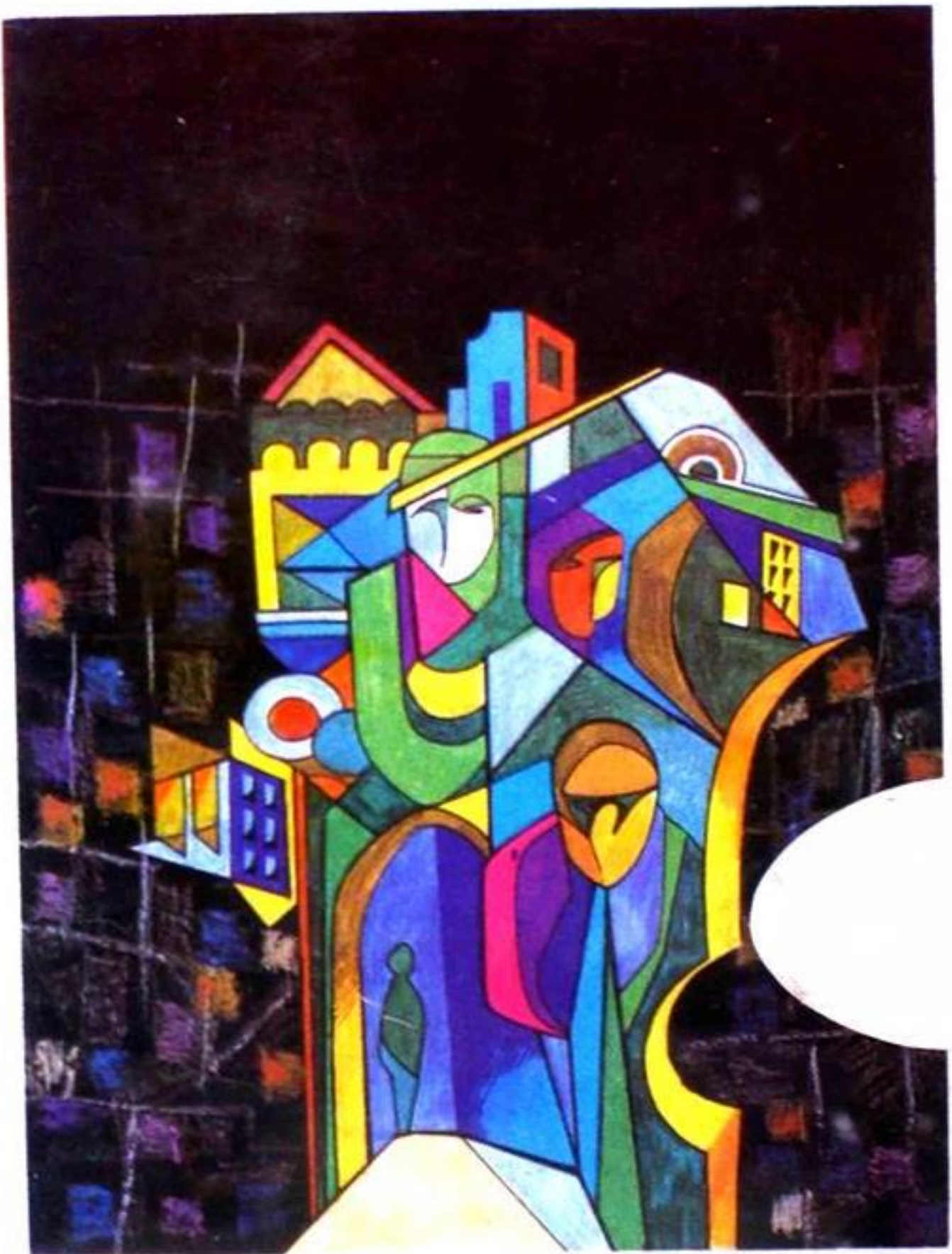


# در دآشوب

احمد فراز



# در دآشوب

۱۹۶۶ء کا آدم جی ادبی نغمہ یافتہ

احمد نواز

# DARD AASHOB

(Urdu Poetry)

by

**AHMAD FARAZ**

Year of Edition 2002

ISBN-81-87666-19-6

Price. Rs. 80/=

نام کتاب..... درد آشوب  
مصنف..... احمد فراز  
سن اشاعت..... ۲۰۰۲ء  
قیمت..... ۸۰ روپے  
مطبع..... کاک پرنٹرس، دہلی

*Published by:*

**Kitabi Duniya**

1955, Turkman Gate, Delhi-6 (INDIA)

E-mail [kitabiduniya@rediffmail.com](mailto:kitabiduniya@rediffmail.com)

محبوب اختر کے نام

فراز اپنے سوا ہے کون تیرا۔  
تجھے ، تجھ سے جدا دیکھا نہ جاتے



## الف

- 11 فنکاروں کے نام
- 14 رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
- 16 قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے ملنگے
- 18 معبود
- 20 جز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
- 23 نہ حریف جاں نہ شریک غم شب انتقار کوئی تو ہو
- 25 شاخِ نہالِ غم
- 28 خود کلامی
- 30 دل تو وہ برگِ خزاں ہے کہ ہوالے جائے
- 32 نہ انتقار کی لذت نہ آرزو کی تھکن
- 34 ہم تو یوں خوش تھے کہ اک تارِ گریبان میں ہے
- 36 خاموش ہو کیوں دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
- 38 اظہار
- 39 خود کشی

# ب

- 40 سن بھی اے نغمہ سنج کنج چمن اب سماعت پہ اعتبار کے
- 42 دل بہلتا ہے کہاں انجم و مہتاب سے بھی
- 44 وفا کے باب میں الزام عاشقی نہ لیا
- 45 شکست
- 46 زیر لب
- 48 ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل بھی کزی ہو جیسے
- 50 کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے
- 52 ہر ایک بات نہ کیوں زہر سی ہماری لگے
- 54 ہمدرد
- 56 خواب
- 57 سو دور یوں پہ بھی میرے دل سے جدا نہ تھی
- 59 جو بھی دکھ یاد نہ تھا یاد آیا
- 61 سوال
- 63 غریب شہر کے نام
- 65 زخم کو پھول تو صرصر کو صبا کہتے ہیں
- 67 گل ہو چراغ مے تو سزاوار سنگ ہیں
- 69 وہی جنوں ہے، وہی کوچہ ملامت ہے

## ج

- 71 پیغام بے
- 76 روز کی مسافت سے چور ہو گئے دریا
- 78 تو کہ انجان ہے اس شہر کے آداب سمجھ
- 80 قرب جز داغ بدائی نہیں دیتا کچھ بھی
- 82 دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
- 84 یہ عالم شوق کا دیکھنا نہ جائے
- 86 خود غرض
- 87 وابستگی
- 89 دل بھی بجھا ہو شام کی پرچھائیاں بھی ہوں
- 90 جب تری یاد کے جگنو چمکے
- 91 ممدوح
- 94 پیام آئے ہیں اس یار بے وفا کے مجھے
- 96 بے نیاز غم پیمان ونا ہو جانا
- 98 دل میں اب طاقت کہاں خونناہہ اٹھانی کرے
- 100 بے سرو ساماں تھے لیکن اتنا اندازہ نہ تھا
- 101 تپتے صحراؤں پہ گر جا سردریا برسا
- 103 افسی کی طرح ڈسنے لگی موج نفس بھی



- 104 اے مرے بیدرد شہر
- 106 گھر میں کتنا سناٹا ہے باہر کتنا شور
- 107 پھر اسی رہ گزار پر شاید
- 109 اب وہ جھونکے کہاں سبایسے
- 111 تریاق
- 113 مستقل محرومیوں پر بھی تو دل مانا نہیں
- 114 تو پاس بھی ہو تو دل بے قرار اپنا ہے
- 116 جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی
- 117 کسی کے تذکرے بستی میں کو بکو جو ہوئے
- 118 مجھ سے پہلے
- 121 کروں نہ یاد مگر کس طرح بھلاؤں اسے
- 123 اب اور کیا کسی سے مراسم بڑھائیں ہم
- 124 اتری تھی شہر گل میں کوئی آتشیں کرن
- 125 کوئی بمسکتا بادل
- 126 کیسی طلب اور کیا اندازے مشکل ہے تقدیر بنے
- 127 اپنی محبت کے افسانے کب تک راز بناؤ گے
- 129 زندگی! اے زندگی



- 131 چند لمحوں کے لیے تو نے میسائی کی
- 132 زعم ایسا کیا کہ لطف دوست ٹھکرانا پڑے
- 134 اب نہ فرصت ہے نہ احساس ہے غم سے اپنے
- 136 یہ تو جب ممکن ہے
- 138 تم بھی خفا ہو لوگ بھی برہم ہیں دوستو
- 140 تو کہاں تھا زندگی کے روز شب آنکھوں میں تھے
- 141 لمحے دفور شوق کے ایسے نہ آئے تھے
- 142 اسی خیال میں تاروں کو رات بھر دیکھوں
- 144 جنبش مڑکاں کہ ہر دم دل کٹائے زخم ہے
- 147 السیہ
- 148 منتظر کب سے تحریر ہے تری تقریر کا
- 150 تمثیل
- 151 آنکھوں میں چہرہ رہے ہیں درد بام کے چراغ
- 153 نظر کی دھوپ میں سائے کھلے ہیں شب کی طرح
- 154 ہم کیا کہ اسی سوچ میں باد چہمنی تھی
- 156 نیند
- 157 خوشبو کا سفر

و

- 159 تجھے اداس کیا خود بھی سوگوار ہونے
- 160 ان دیکھے دیاروں کے سفیر
- 162 اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
- 164 اچھا تھا اگر زخم نہ بھرتے کوئی دن اور
- 166 ترس رہا ہوں مگر تو نظر نہ آجھ کو
- 168 میں اور تو
- 170 کون آتا ہے مگر آس لگائے رکھنا
- 171 میں کہ پر شور سمندر تھے مرے پاؤں میں

## فن کاروں کے نام

تم نے دھرتی کے ماتھے پہ افتاں چُنی  
خود اندھیری فضاؤں میں پلتے رہے  
تم نے دُنیا کے خوابوں کی جنت بُنی  
خود فلاکت کے دوزخ میں جلتے رہے  
تم نے انسان کے دل کی دھڑکن سنی  
اور خود سہم بھر خوں اُگلتے رہے



جنگ کی آگ دنیا میں جب بھی چلی  
 امن کی لوریاں تم سُناتے رہے  
 جب بھی تخریب کی توند آندھی چلی  
 روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے  
 تم سے انساں کی تہذیب پھولی پھلی  
 تم مگر ظلم کے تیر کھاتے رہے

تم نے شہکار خونِ جگر سے سجائے  
 اور اس کے عوض ہاتھ کٹوا دیے  
 تم نے دنیا کو امرت کے چشمے دکھائے  
 اور خود زہرِ قاتل کے پیالے پیے  
 تم نے ہر ایک کے دکھ اپنے دل سے لگائے  
 تم جیسے تو زمانے کی حسا طر جیسے



تم پیمبر نہ تھے عرش کے مدعی  
 تم نے دنیا سے دنیا کی باتیں کہیں  
 تم نے ذروں کو تاروں کی تنویر دی  
 تم سے گو اپنی آنکھیں بھی چھپنی گئیں  
 تم نے دکھتے دلوں کی مسیحائی کی  
 اور زمانے سے تم کو صلیبیں ملیں

کاخ و دربار سے کوچہ دار تک  
 کل جو تھے آج بھی ہیں وہی سلسلے  
 جیتے جی تو نہ پانی چمن کی مہک  
 موت کے بعد پھولوں کے مرقد ملے  
 اے مسیحاؤ! یہ خود کشی کب تک  
 ہیں زمیں سے فلک تک بڑے فاصلے



رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ  
 آپھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ  
 تو بھی تو کبھی مجھ کو مسانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو  
 رسمِ ورہِ ذنیبا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم  
 تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم  
اے راحتِ جاں مجھ کو رلانے کے لیے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں  
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ



قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے  
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے  
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مرا اسم کے لیے  
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہاں چکے لٹ بھی چکے  
اور محبت وہی انداز پرانے مانگے



زندگی ہم ترے دُاعوں سے لہے شرمندہ  
اور تو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فراز  
ٹل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے



## معبود

بہت حسین ہیں تیری عقیدتوں کے گلاب  
 حسین تر ہے مگر ہر گلِ خیالِ ترا  
 ہم ایک درد کے رشتے ہیں منسلک دونوں  
 تجھے عزیز مرافق مجھے جسمالِ ترا

مگر تجھے نہیں معلوم فترتوں کے الم  
 تری نگاہ مجھے فاصلوں سے چاہتی ہے  
 تجھے خبر نہیں شاید کہ خلوتوں میں مری  
 لہو اگلتی ہوئی زندگی کراہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم وہاں ہیں جہاں  
 یہ فن نہیں ہے ادبیت ہے زندگی بھر کی  
 یہاں گلوئے جنوں پر کند پڑتی ہے  
 یہاں فلم کی زباں پر ہے نوک خنجر کی

ہم اُس قبیلہ و خشتی کے دیوتا ہیں کہ جو  
 پُجاریوں کی عقیدت پہ چھوڑ جاتے ہیں  
 اور ایک اُت کے معبود سبج ہوتے ہی  
 وفا پرست صلیبوں پہ چھوڑ جاتے ہیں



جَزْتَرے کوئی بھی دن اب نہ جانے میرے  
تو کہاں ہے مگر اے دوست پرانے میرے

تو بھی خوشبو ہے مگر میرا تخبس بے کار  
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

شمع کی لو بھتی کہ وہ تو تھا مگر سحر کی رات  
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

خلق کی بے خبری ہے کہ مری رسوائی  
لوگ مجھ کو ہی سناتے ہیں فسانے میرے



لُٹ کے بھی خوش ہوں کھٹکوں سے بھر ہے دمن  
دیکھ غارت گردل یہ بھی خزانے میرے

آج اک اور برس بیت گیا اُس کے بغیر  
جس کے ہوتے ہوئے تھے زمانے میرے

— ق —

کاش تو بھی مری آواز کہیں سُنتا ہو  
پھر پکارا ہے تجھے دل کی صدائے میرے

کاش تو بھی کبھی آجائے مسیحائی کو  
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دکھانے میرے

کاش اوروں کی طرح میں بھی کبھی کہہ سکتا  
بات سُن لی ہے مری آج خدانے میرے

تو ہے کس حال میں اے زود فراموش مے  
مجھ کو تو چھین لیا عہدِ وفا نے میرے  
چارہ گریوں تو بہت ہیں مگر اے جانِ فراز  
جز تے اور کوئی زحمت نہ جانے میرے





نہ حریفِ جاں نہ شریکِ غمِ شبِ انتظار کوئی تو ہو  
کے بزمِ شوق میں لائیں ہم دلِ بے قرار کوئی تو ہو

کے زندگی ہے عزیزِ اب، کے آرزوئے شبِ طرب  
مگر اے نگارِ وفا طلب ترا عتبار کوئی تو ہو

کہیں تارِ دامنِ گل ملے تو یہ مان لیں کہ چمنِ کھلے  
کہ نشانِ فصلِ بہار کا سرِ شاخسار کوئی تو ہو

یہ اُداس اُداس سے ہم و درِ یہ اجاڑ اُجاڑ سی رہگزر  
چنو ہم نہیں نہ سہی مگر سرِ کوئے یار کوئی تو ہو

یہ سکونِ جاں کی گھڑی ڈھلے تو پیرا غِ دل ہی نہ بھجے چلے  
 وہ بلا سے ہو عسیمِ عشق یا غمِ روزگار کوئی تو ہو

سے مقتلِ شبِ آرزو رہے کچھ تو عشق کی آبرو  
 جو نہیں عدو تو فراز تو کہ نصیبِ دار کوئی تو ہو

## شاخِ نہالِ غم

میں ایک برگِ خزاں کی مانند  
کب سے شاخِ نہالِ غم پر  
لرز رہا ہوں

مجھے ابھی تک ہے یاد وہ جاں نگار ساعت  
کہ جب بہ بہاروں کی آخری شام  
مجھ سے کچھ یوں لپٹ کے روئی  
کہ جیسے اب عمر بھرنے دیکھے گا  
ہم میں اک دوسرے کوئی  
وہ رات کتنی کڑی تھی  
جب آنندھیوں کے شبِ خوں سے  
بونے گل بھی لہو لہو تھی



سحر ہوئی جب تو پیر لوں خشک زرد روتے تھے  
 کہ جیسے مقتل میں میسے کچھ پڑے ہوئے رفیقوں کی  
 زخم خوردہ برہنہ لاشیں  
 گڑھی ہوئی ہوں  
 میں جانتا تھا

کہ جب یہ بو جھیل بلند اشجار  
 جن کی کہنہ جڑیں زمیں کی عمیق گہرائیوں میں برسوں سے جاگزیں تھیں  
 ہجومِ صرصر میں چند لمحے یہ ایستادہ نہ رہ سکے تو  
 میں ایک برگِ خزاں بھی  
 شاخِ نہالِ عجم پر نہ رہ سکوں گا

وہ ایک پل تھا کہ ایک رت تھی  
 مگر مرے واسطے بہت تھی  
 مجھے خبر ہے کہ کل بہاروں کی اولیں صبح  
 پھر سے بے برگ و بار شاخوں کو

زندگی کی نسئی قبائیں عطا کرے گی  
مگر مراد دل و دھڑک رہا ہے  
مجھے، جسے آنڈھیوں کی پورس  
خزاں کے طوفاں نہ چھو سکے تھے  
کہیں سچم بہار — شاخ نہالِ غم سے  
جدا نہ کرے



## خود کلامی

دیکھے ہی نہیں وہ لب و رخسار وہ گیسو  
 بس ایک کھنکھتی ہوئی آواز کا جادو  
 حیران پریشاں لیے پھرتا ہے ہر سو  
 پابند تصور نہیں وہ جلوۂ بیتاب  
 ہو دور تو جگنو ہے قریب آئے تو خوشبو  
 لہرائے تو شعلہ ہے چھنک جائے تو گھنگھرو  
 باندھے ہیں نگاہوں نے صداؤں کے بھی منظر  
 وہ قہقہے جیسے بھری برسات میں کو کو  
 جیسے کوئی قمری سر شمشاد لب جو

اے دل تری باتوں پہ کہاں تک کوئی جائے  
جذبات کی ذبیحہ میں کہاں سوچ کے پہلو  
کب آئے ہیں فتراک ہیں وحشت زدہ آہو  
مانا کہ وہ لب ہوں گے شفق رنگ و شرر خو  
نشاہد کہ وہ عارض ہوں گل تر سے بھی خوشرو  
دلکش ہی سہی حلقہ زلف و حنیم ابرو  
یہ کس کو خبر کس کا مقدر ہے یہ سب کچھ  
خوابوں کی گھٹاؤں اور برس جائے گی اور تو  
لوٹ آئے گا لے کر فقط آہیں فقط آنسو



دل تو وہ برگِ خزاں ہے کہ ہوا لے جائے  
غم وہ آندھی ہے کہ صحرا بھی اڑا لے جائے

کون لایا تری محفل میں ہمیں ہوش نہیں  
کوئی آئے تری محفل سے اٹھا لے جائے

اور سے اور مٹھے جاتے ہیں معیارِ وفا  
اب متاعِ دل و جاں بھی کوئی کیا لے جائے

جانے کب اُبھرے تری یاد کا ڈوبا ہوا چاند  
جانے کب دھیان کوئی ہم کو اڑا لے جائے

یہی آوارگیِ دل ہے تو منزل معلوم  
جو بھی آئے تری باتوں میں لگائے جائے

دشتِ غربت میں تمہیں کون بکارے گا فراز  
چل پڑو خود ہی جدھر دل کی صدا لے جائے





نہ انتظار کی لذت نہ آرزو کی تھکن  
بجھی ہیں درد کی شمعیں کہ سو گیا ہے بدن

سُلاک رہی ہیں نہ جانے کس آنچ سے نکھیں  
نہ آنسوؤں کی طلب ہے نہ رنج گوں کی جلن

دلِ فریب زدہ! دعوتِ نظر پہ نہ جا  
یہ آج کے قد و گیسو ہیں کل کے دار و رسن

غریبِ شہر کسی سایہ شجر میں نہ بیٹھ  
کہ اپنی چھاؤں میں خود جیل ہے ہیں سرد و سمن

یہاں قُرب سے پہلے اُجاڑ دیتی ہیں  
جُدائیوں کی ہوائیں محبتوں کے چمن  
وہ ایک ات گزر بھی گئی مگر اب تک  
وصالِ یار کی لذت سے ٹوٹتا ہے بدن  
پھر آج شب تمہے قدموں کی چاٹ کے ہمراہ  
سنائی دی ہے دلِ نامراد کی دھڑکن  
یہ ظلم دیکھ کہ تو حُب ان شاعری ہے مگر  
مری عننزل میں ترانام بھی ہے جرمِ سُخن  
امیرِ شہرِ غریبوں کو لوٹ لیتا ہے  
کبھی یہ حسیلہ مذہب کبھی بنامِ وطن  
ہوائے دہر سے دل کا چراغ کیا بجھتا  
مگر فرساز سلامت ہے یار کا دامن



ہم تو یوں خوش تھے کہ اک تار گریبان میں ہے  
کیا خیر تھی کہ بہار اس کے بھی ارمان میں ہے

ایک ضرب اور بھی اے زندگی تیشہ بدست  
سانس لینے کی سکت اب بھی مری جان میں ہے

ہیں تجھے کھوکھے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے  
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انسان میں ہے

فاصلے قریب کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں!  
میں تم سے شہر سے دُور اور تو مرنے دھیان میں ہے



سہر لویاں فروزاں ہے ابھی ایک چراغ  
انہی سیم سحری! کچھ ترے امکان میں ہے؟

دل دھڑکنے کی صدا آتی ہے گلے گلے  
جیسے اب بھی تری آواز مرے کان میں ہے

خلقتِ شہر کے ہر ظلم کے باوصف فراز  
ہائے وہ ہاتھ کہ اپنے ہی گریبان میں ہے





خاموش ہو کیوں دادِ جفا کیوں نہیں دیتے  
بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے

وحشت کا سبب روزِ نِ زنداں تو نہیں ہے  
مہر و مہر و انجم کو کبھی کیوں نہیں دیتے

اک یہ بھی تو اندازِ علاجِ غمِ جاں ہے  
اے چارہ گرو، دردِ بڑھا کیوں نہیں دیتے

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے؟  
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے؟

رہزن ہو تو حاضر ہے متاعِ دلِ جاں بھی  
رہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے

کیا بیت گئی اب کے فرازِ اہلِ چمن پر؟  
یارِ انِ قفسِ مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے

# انظار

پتھر کی طرح اگر میں چپ ہوں  
 تو یہ نہ سمجھ کہ میری ہستی  
 بیگانہ شعلہٴ وفا ہے  
 تحقیر سے یوں نہ دیکھ مجھ کو  
 اے سنگ تراش! تیرا تیشہ  
 ممکن ہے کہ ضربِ اولیں سے  
 پہچان سکے کہ میرے دل میں  
 جو آگ ترے لیے دبی ہے  
 وہ آگ ہی میری زندگی ہے

## خودکشی

وہ پیمان بھی ٹوٹے جن کو  
ہم سمجھے تھے پائندہ  
وہ شمعیں بھی داغ ہیں جن کو  
برسوں رکھنا تابندہ  
دونوں وفا کر کے ناخوش ہیں  
دونوں کیے پر شرمندہ  
پیار سے پیارا جیون پیارے  
کیا ماضی کیا آئندہ  
ہم دونوں اپنے قاتل ہیں  
ہم دونوں اب تک زندہ





سُن بھی اے نعمتِ سنجِ کنجِ چمن اب سماعت کا اعتبار کے  
کون سا پیرہن سلامت ہے دیجیے دعوتِ بہار کے

جل بجبیں دردِ ہجر کی شمعیں گھل چکے نیم سوختہ پیکر  
سر میں سو دوائے خام ہو بھی تو کیا طاقت و تابِ انتظار کے

نقدِ جاں بھی تو نذر کر آئے اور ہم مفلسوں کے پاس تھا کیا  
کون ہے اہلِ دل میں اتنا غنی اس قدر پاسِ طبعِ یار کے

کا ہنسِ ذوقِ جستجو معلومِ داغ ہے دل چراغ ہیں آنکھیں  
ما تم شہرِ آرزو کیجے فرصتِ نعمتِ قرار کے

کون دارائے ملکِ عشق ہو ا کس کو جاگیرِ چشم و زلف ملی  
”نخونِ فرہاد بر سرِ فرہاد“ قصہ شیریں پر اختیار کے

حاصلِ مشربِ میجانی، سنگِ تحقیر و مرگِ سوالی  
قامتِ یار ہو کہ رفعتِ ارانِ صلیبوں کا اعتبار کے



دل بہلتا ہے کہاں انجم و مہتاب سے بھی  
اب تو ہم لوگ گئے دیدہ بے خواب سے بھی

رو پڑا ہوں تو کوئی بات ہی ایسی ہوگی  
میں کہ واقف تھا ترے ہجر کے آداب سے بھی

کچھ تو اُس آنکھ کا شیوہ ہے خفا ہو جانا  
اور کچھ بھول ہوئی ہے دل بیتاب سے بھی

اے سمندر کی ہوا تیرا کرم بھی معلوم  
پسائیں ساحل کی تو بھتی نہیں سیلاب سے بھی

کچھ تو اُس حُسن کو جانے ہے زمانہ سارا  
اور کچھ بات چلی ہے مرے اجباب سے بھی

دل کبھی غم کے سمندر کا ثنا ورتھا فراز  
اب تو خوف آتا ہے اک موجِ پایاب سے بھی





وفا کے باب میں الزامِ عاشقی نہ لیا  
کہ تیری بات کی اور تیرا نام بھی نہ لیا

خوشا وہ لوگ کہ محرومِ التفات رہے  
ترے کرم کو بہ اندازِ سادگی نہ لیا

تمہارے بعد کئی ہاتھ دل کی سمت بڑھے  
ہزار شکر گریباں کو ہم نے سی نہ لیا

تمام مستی و تشنہ لبی کے ہنگامے  
کسی نے سنگ اٹھایا، کسی نے مینا لیا

فرازِ ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی  
کہ رات بھی تھی اندھیری چراغ بھی نہ لیا

## شکست

بارہا مجھ سے کہا دل نے کہ اے شجدرہ گر  
تو کہ الفاظ سے اصنام گرمی کرتا ہے  
کبھی اس حسنِ دل آرا کی بھی تصویر بنا  
جو تری سوچ کے خاکوں میں لہو بھرتا ہے

بارہا دل نے یہ آواز سُنی اور چاہا  
مان لوں مجھ سے جو وجدان مرا کہتا ہے  
لیکن اس عجز سے ہارامے فن کا جادو  
چاند کو چاند سے بڑھ کر کوئی کیا کہتا ہے

## زیر لب

کس بوجھ سے جسم ٹوٹتا ہے  
اتنا تو کڑا سفر نہیں تھا  
دو چار قدم کا فاصلہ کیا  
پھر راہ سے بے خبر نہیں تھا  
لیکن یہ تھکن یہ لڑکھڑاہٹ  
یہ حال تو عمر بھر نہیں تھا

آغازِ سفر میں جب چلے تھے  
 کب ہم نے کوئی دیا جلا یا  
 کب عہدِ وفا کی بات کی تھی  
 کب ہم نے کوئی فریب کھایا  
 وہ شام وہ چاندنی وہ خوشبو  
 منزل کا کسے خیال آیا

تو محوِ سخن تھی مجھ سے لے لیں  
 میں سوچ کے جاں بُن رہا تھا  
 میرے لیے زندگی تڑپ تھی  
 تیرے لیے غم بھی قہقہا تھا  
 اب تجھ سے کچھ ٹکے سوچتا ہوں  
 کچھ تو نے کہا تھا! کیا کہا تھا





ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل بھی کڑی ہو جیسے  
تیرا ملنا بھی حبدائی کی گھڑی ہو جیسے

اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں  
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے

کتنے ناداں ہیں ترے بھولنے والے کہ تجھے  
یاد کرنے کے لیے عمر پڑی ہو جیسے

تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر  
یہ گرہ اب کے مرے دل میں پڑی ہو جیسے

منزلیں دُور بھی ہیں منزلیں نزدیک بھی ہیں  
اپنے ہی پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے

آج دل کھول کے روئے ہیں تو یوں خوش ہیں فراز  
چند لمحوں کی یہ راحت بھی بڑی ہو جیسے



کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے  
جو مستقل سکوت سے دل کو لہو کرے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دکھ نہیں  
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی  
خود کو گنوا کے کون تری جستجو کرے

اب تو یہ آرزو ہے کہ وہ زخم کھائیے  
تا زندگی یہ دل نہ کوئی آرزو کرے

تجھ کو مجھلا کے دل ہے وہ شرمندہ نظر  
اب کوئی حادثہ ہی ترے روبرو کرے

چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فراز  
دنیا تو عرضِ حال سے بے آبرو کئے





ہر ایک بات نہ کیوں نہ ہر سی ہماری لگے  
کہ ہم کو دستِ زمانہ سے زحمتِ کاری لگے

اُداسیاں ہوں مسائل تو دل نہیں روتا  
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری لگے

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر  
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

علاجِ اسِ دلِ دردِ آتشِ ناکا کیا کیجے  
کہ تیر بن کے جسے حرفِ نغمہ ساری لگے

ہمارے پاس بھی بیٹھوس اتنا چاہتے ہیں  
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمھاری لگے

فراز تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ  
یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے

# ہمدرد

اے دل ان آنکھوں پر نہ جا  
جن میں دفورِ رنج سے  
کچھ دیر کو تیرے لیے  
آنسو اگر لہرا گئے

یہ چند لمحوں کی چمک  
جو تجھ کو پاگل کر گئی!  
ان جگنوؤں کے نور سے  
چمکی ہے کب وہ زندگی  
جس کے مستدر میں رہی  
صبح طلب سے تیرگی

کس سوچ میں گم سم ہے تو  
اے بے خبر! ناداں نہ بن  
تیری فسردہ رُوح کو  
چاہت کے کانٹوں کی طلب  
اور اُس کے دامن میں فقط  
ہمدردیوں کے پھول ہیں



## خواب

وہ چاند میرا ہمسفر تھا  
 دُوری کے اُچارِ جنکلوں میں  
 اب میری نظر سے چھپ چکا ہے

اک عمر سے میں ملول و تنہا  
 ظلمات کی رہ گزار میں ہوں  
 میں آگے بڑھوں کہ لوٹ جاؤں  
 کیا سوچ کے . . . انتظار میں ہوں  
 کوئی بھی نہیں جو یہ بتائے  
 میں کون ہوں کس دیا میں ہوں



سو دُور یوں پہ بھی مئے دل سے جدا نہ بھتی  
تو میری زندگی بھتی مگر بے وفا نہ بھتی

دل نے ذرا سے غم کو قیامت بنا دیا  
ورنہ وہ آنکھ اتنی زیادہ نہت نہ بھتی

یوں دل لرز اٹھا ہے کسی کو پکار کر  
میری صدا بھی جیسے کہ میری صدا نہ بھتی

برگِ خزاں جو شاخ سے ٹوٹا وہ خاک تھا  
اس جاں سپردگی کے تو تابل ہو انہ تھا

جگنو کی روشنی سے بھی کیا کیا بھڑک اٹھی  
اس شہر کی فضا کہ چراغ آشنا نہ تھی

مرہونِ آسماں جو رہے اُن کو دیکھ کر  
خوش ہوں کہ میرے ہونٹوں پہ کونئی دعا نہ تھی

ہر جسم داغ داغ تھا لیکن سر از ہم  
بدنام یوں ہوئے کہ بدن پر قبائے نہ تھی



جو بھی دکھ یاد نہ تھا یاد آیا  
آج کیا جانے کیسا یاد آیا

پھر کوئی ہاتھ ہے دل پر جیسے  
پھر ترا عمداً وفا یاد آیا

جس طرح دھند میں لپٹے ہوئے پھول  
ایک ایک نقش ترا یاد آیا

ایسی مجبوری کے عالم میں کوئی  
یاد آیا بھی تو کیسا یاد آیا



اے رفیقو سہ منزل جا کر  
کیا کوئی آبلہ پا یاد آیا

یاد آیا تھا بچھڑنا تیرا  
پھر نہیں یاد کہ کیا یاد آیا

جب کوئی زخم بھرا داغ بنا  
جب کوئی بھول گیا یاد آیا

یہ محبت بھی ہے کیا روگ فراز  
جس کو بھولے وہ سدا یاد آیا

## سوال

(فراق - کی تصویر دیکھ کر)

اک سنگ تراش جس نے برسوں  
ہمیروں کی طرح صنم تراشے  
آج اپنے صنم کدے میں تنہا  
مجبور نہ ڈھال زحسم خوردہ  
دن رات پڑا کراہتا ہے

چہرے پہ اُہماڑ زندگی کے  
لمحات کی آن گنت خراشیں  
آنکھوں کے شکستہ مرقدوں میں  
رُوٹھی ہوئی حسرتوں کی لاشیں

سانسوں کی تھکن بدن کی ٹھنڈک  
 احساس سے کب تک لہولے  
 ہاتھوں میں کہاں سکت کہ بڑھ کر  
 خود ساختہ پکیروں کو چھو لے

یہ زخمِ طلب یہ نامرادی  
 ہر بُت کے لبوں پہ ہے تسلیم  
 اے تیشہ بدست دیوتاؤ!  
 تخلیقِ عظیم ہے کہ خالق  
 انسان جو اب چاہتا ہے

## غریب شہر کے نام!

غریب شہر تری دکھ بھری نواپہ سلام  
تری طلب تری چاہت تری وفاپہ سلام  
ہر ایک حرفِ تمنائے دلربا پہ سلام  
حدیثِ درد و سکوتِ سخن اداپہ سلام

دریدہ دل! ترے آہنگ سازِ عزم پہ نثار  
گہر فروش! ترے رنگِ چشمِ عزم پہ نثار



جنوں کا شہر ہے آباد، فصلِ دار کی خیر  
 ہر ایک دل ہے گریبان، بھری بہار کی خیر  
 بجھے ہیں ہم، مگر شمعِ رہ گزار کی خیر  
 تمام عمر تو گزے اس منتظر کی خیر  
 رخِ نگار و عنبرِ یار کو نظر نہ لگے  
 گلہ نہیں ہے اگر آنکھ عمر بھر نہ لگے

دل و نظر کی شکستوں کا کیا شمار کریں  
 شمارِ زخمِ عبت ہے نجات سے پہلے  
 کچھ اور دیدہٴ خوں رنگ کو گلاب کریں  
 صبا کا ذکر قیامت ہے رات سے پہلے

ابھی لبوں پہ حکایاتِ خوں چکیدہ سہی  
 بہ سینہ رہ سپرم دست و پا بریدہ سہی



زخم کو پھول تو صرصر کو صبا کہتے ہیں  
جانے کیا دور ہے کیا لوگ ہیں کیا کہتے ہیں

کیا قیامت ہے کہ جن کے لیے رُک رُک کے چلے  
اب وہی لوگ ہمیں آبلہ پا کہتے ہیں

کوئی بتلاؤ کہ اک عمر کا بچھڑا محبوب  
اتفاقاً کہیں مل جائے تو کیا کہتے ہیں

یہ بھی اندازِ سخن ہے کہ جہن کو تیری  
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کہتے ہیں

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کر لیں  
ہم جسے چھو نہ سکیں اُس کو خدا کہتے ہیں

کیا تعجب ہے کہ ہم اہل تمنا کو فرار  
وہ جو محروم تمنا ہیں بُرا کہتے ہیں



گل ہو چیرا غمے تو سزاوار سنگ ہیں  
میںا سرشت ہم بھی شہیدانِ رنگ ہیں

مطرب کی بے دلی ہے کہ محفل کی بے حسی  
کس تیغ سے ہلاک نوا ہائے چنگ ہیں؟

دل خلوتِ خیال کی آرائشوں میں گم  
آنکھیں نگار خانہ ہستی پہ دنگ ہیں

تاب تو اں نہیں ہے مگر جو صلے تو دیکھ  
ثیشہ صفات پھر بھی حریفانِ سنگ ہیں



اے حسن سادہ دل تری رسوائیاں نہ ہوں  
کچھ لوگ کشتہ ہو سں نام و ننگ ہیں

معدور ہیں تلون حسنِ خاطر کو کیا کریں  
ہم خود نرازا اپنی طبیعت سے تنگ ہیں



وہی جنوں ہے، وہی کوچہٴ ملامت ہے  
شکستِ دل پہ بھی عہدِ وفا سلامت ہے

یہ ہم جو باغ و بہاراں کا ذکر کرتے ہیں  
تو مدعا وہ گلِ تر وہ سر و قامت ہے

بجا یہ فرصتِ ہستی مگر دلِ ناداں  
نہ یاد کر کے اُسے بھولنا قیامت ہے

چلی چلی یونہی رسمِ وفا و مشقِ ستم  
کہ تیغِ یار و سرِ دوستاں سلامت ہے

سکوتِ بحر سے ساحل لرز رہا ہے مگر  
یہ خاموشی کسی طوفان کی علامت ہے

عجیب وضع کا احمد فراز ہے شاعر  
کہ دل دریدہ مگر پیرہن سلامت ہے

## پیغامِ ابر

میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں  
اپنے اپنے دکھ کی تاریکی لیے  
تم آگے کیوں میرے پاس  
غم کے انباروں کو کا ندھوں پر دھرے  
بوجھل صلیبوں کی طرح  
آشفٹ مَو افسردہ رُو  
ہونٹ محروم تکلم پر پُسر ایا التماس  
اس تمنا پر کہ تم کو مل سکے  
غم کے انباروں کے بدلے  
مسکراہٹ کی کرن۔۔۔ جینے کی آس



میں مگر کرنوں کا سوداگر نہیں  
 میں نہیں جو ہر شناس  
 صورتِ انبوہ در یوزہ گراں  
 سب کے دل میں قہقہوں سے چور  
 لیکن آنکھ سے آنسو رواں  
 سب کے سینوں میں اُمیدوں کے چراغاں  
 اور چہروں پر شکستوں کا دُھواں  
 زندگی سب سے گریزاں  
 سوئے مقتلِ سبِ واں  
 سب نحیف و ناتواں  
 سب کے سب اک دُسرے کے ہم سفر  
 اک دوسرے سے بدگماں  
 سب کی آنکھوں میں خیالِ مرگ سے خوف و ہراس  
 میری باتوں سے مری آواز سے  
 تم نے یہ جانا کہ میں بھی

لے کے آیا ہوں تمہارے واسطے وہ معجزے  
 جن سے بھر جائیں گے پل بھر میں تمہارے  
 ان گنت صدیوں کے لاتعداد زخم  
 دم بخود سانسوں کو ٹھہرائے ہوئے بے جان جسم  
 منتظر ہیں قُمْ بِإِذْنِي کی صدائے سحر کے  
 ایشیا پیغمبروں کی سرزمین  
 اور تم اس کے زبوں قسمت مکھیں — تیرہ حبیبیں  
 من و سلویٰ کے لیے دامن کشا  
 قحط خوردہ زار و سببار و خزیں  
 صرف تقدیر و توکل پر لھتی  
 تم کو شیرین طرب کی چاہ لیکن بے ستونِ عزم کی سہل کو  
 چیرنے کا حوصلہ، یارا نہیں  
 تم یہ بیضیا کے قائل، بازوئے فرہاد کی تو سب سے بہرہ ور نہیں  
 تم کہ ہو کو پہرہ گرفتار نہ . . . . . زندگی سے دور  
 مردہ ساحروں کی بے نشاں قبروں کے سجادہ نشین



خاکداں کی اس گلِ تاریک کا  
میں بھی اک پیکر ہوں، پیکرِ گر نہیں  
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

ریت کے تپتے ہوئے ٹیلوں پہ استادہ ہوتم  
سایہ ابرِ رواں کو دیکھتے رہنا تمہارا جزوِ دین

سات قلمزم موجزن چاروں طرف  
اور تمہارے سبخت میں شبنم نہیں  
اپنے اپنے دکھ کی بوجھل گٹھڑیوں کو

تم نے کھولا ہے کبھی؟

اپنے ہم جنسوں کے سینوں کو ٹٹولا ہے کبھی؟

سب کی روئیں گر سنا... سب کی متاعِ درو میں

دوسروں کا خون پینے کی ہوس

ایک کا دکھ دوسروں سے کم نہیں

ایک کا دکھ دوسرے سے کم نہیں

ایک کا دکھ تشنگی، بیچارگی

دوسروں کا دکھ مگر افراطِ مے... دیوانگی

پیاہس اور نشے کا دکھ  
اپتے انباروں سے مل کر چھانٹ لو  
پیاہس اور نشے کا دکھ اک دوسرے میں بانٹ لو  
پھر تمہاری زندگی شاید نہ ہو  
شاکی عرشِ بریں و رحمتِ اللعالمیں  
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں





روز کی مسافت سے چور ہو گئے دریا  
پتھروں کے سینوں پر تھکے سو گئے دریا

جانے کون کاٹے گا فصل لعل و گوہر کی  
رتیلی زمینوں میں سنگ بوجے دریا

اے سحابِ غم کب تک یہ گریزا نکھوں سے  
انتظارِ طوفان میں خشک ہو گئے دریا

چاندنی میں آتی ہے کس کو ڈھونڈنے خوشبو  
ساحلوں کے پھولوں کو کب سے رو گئے دریا

بجھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے  
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

دل چٹان کی صورت سیلِ غم پہ پہنتا ہے  
جب نہ بن پڑا کچھ بھی داغ دھو گئے دریا

زخمِ نامرادی سے ہم فراز زندہ ہیں  
دیکھنا سمندر میں عسقرق ہو گئے دریا



تو کہ انجان ہے اس شہر کے آداب سمجھ  
پھول روئے تو اُسے خندہ تہا داب سمجھ

کہیں آجائے میسر تو مست در تیرا  
ورنہ آسودگی دہر کو نایاب سمجھ

حسرتِ گریہ میں جو آگ ہے اشکوں میں نہیں  
خشک آنکھوں کو مری چشمہ بے آب سمجھ

موجِ دریا ہی کو آوارہ صد شوق نہ کہہ  
ریگِ ساحل کو بھی لب تشنہ بیلاب سمجھ

یہ بھی واسے کسی مانوس کرن کی خاطر  
روزِ نِ در کو بھی اک دیدہ بے خواب سمجھ

اب کسے ساحلِ امید سے نکلتا ہے فراز  
وہ جو اک کشتیِ دل تھی اُسے غرقاب سمجھ





قرب جز داغِ جدائی نہیں دیتا کچھ بھی  
تو نہیں ہے تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

دل کے زخموں کو نہ رو دو دستِ احسانِ مجھ  
ورنہ وہ دستِ حسائی نہیں دیتا کچھ بھی

کیا اسی زہر کو تریاق سمجھ کر پی لیں  
ناصحوں کو تو سچھائی نہیں دیتا کچھ بھی

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں  
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

سوچتا ہوں تو سہراک نقش میں دنیا آباد  
دیکھتا ہوں تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

یوسفِ شعر کو کس منصر میں لائے ہو فراز  
ذوقِ آشفتنے نوائی نہیں دیتا کچھ بھی



دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا  
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

اب اُسے لوگ سمجھتے ہیں گرفتار مرا  
سخت نادم ہے مجھے دام میں لانے والا

صبح دم چھوڑ گیا نکمہتِ گل کی صورت  
رات کو غنچہ دل میں سمٹ آنے والا

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اُس سے  
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

تیرے موتے مٹے آجاتی تھی ساری دنیا  
آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا

منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں  
کون آئے گا یہاں کون ہے آنے والا

کیا خبر تھی جو مری جاں میں گھلا ہے اتنا  
ہے وہی مجھ کو سردار بھی لانے والا

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے  
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

تم تکلف کو بھی اجلاس سمجھتے ہو فراز  
دوست ہوتا نہیں ہر ماتھ ملا نے والا





یہ عالم شوق کا دیکھنا نہ جائے  
وہ بُت ہے یا خدا دیکھنا نہ جائے

یہ کن نظروں سے تو نے آج دیکھا  
کہ تیرا دیکھنا دیکھنا نہ جائے

ہمیشہ کے لیے مجھ سے کچھ طرب  
یہ منظر بارہا دیکھنا نہ جائے

غلط ہے جو سنا، پر آزما کر  
تجھے اے بے وفا دیکھنا نہ جائے

یہ محرومی نہیں پکس وفا ہے  
کوئی تیرے سوا دیکھا نہ جائے

یہی تو آشنا بنتے ہیں آہنہ  
کوئی نا آشنا دیکھا نہ جائے

یہ میرے ساتھ کیسی روشنی ہے  
کہ مجھ سے راستہ دیکھا نہ جائے

فراز اپنے سوا ہے کون تیرا  
تجھے تجھ سے جدا دیکھا نہ جائے

## خود غرض

اے دل! اپنے درد کے کارن تو کیا کیا بنیاب رہا  
 دن کے ہنگاموں میں ڈوبارا توں کو بے خواب رہا  
 لیکن تیرے زخم کا مرہم تیرے لیے نایاب رہا

پھر اک انجانی صورت نے تیرے دکھ کے گیت سُنے  
 اپنی سُنڈرتا کی کرنوں سے چاہت کے خواب بُنے  
 خود کانٹوں کی بارہ سے گزری تیری اہ میں پھول چُنے

اے دل جس نے تیری محرومی کے داغ کو دھویا تھا  
 آج اُس کی آنکھیں پریم تھیں اور تو سوچ میں کھویا تھا  
 دیکھ پر اے دکھ کی خاطر تو بھی کبھی یوں رویا تھا ہے

# واستگی

آگئی پھر وہی پہاڑسی رات  
دوشس پر پھر کی صلیب لیے  
ہر ستارہ ہلاکِ صبح طلب  
منزلِ خواہشِ صلیب لیے

اس سے پہلے بھی تمام وصل کے بعد  
کاروانِ دل و نگاہ چلا  
اپنی اپنی صلیب اٹھائے ہوئے  
ہر کوئی سوئے قتل گاہ چلا



کتنی بانہوں کی ٹہنیاں ٹوٹیں  
 کتنے ہونٹوں کے پھول چاک ہوئے  
 کتنی آنکھوں سے چھین گئے موتی  
 کتنے چہروں کے رنگ خاک ہوئے

پھر بھی ویراں نہیں ہے کونے مراد  
 پھر بھی شب زندہ دار ہیں زندہ  
 پھر بھی روشن ہے بزمِ رسمِ وفا  
 پھر بھی ہیں کچھ چراغ تابندہ

وہی قاتل جو اپنے ہاتھوں سے  
 ہر سیحا کو وار کرتے ہیں  
 پھر اسی کی مراجعت کے لیے  
 حشر تک انتظار کرتے ہیں



دل بھی بجبا ہو شام کی پرچھائیاں بھی نہیں  
مر جائیے جو ایسے میں تنہائیاں بھی نہیں

آنکھوں کی سرخ لہر ہے موجِ سپردگی  
یہ کیا ضرور ہے کہ اب انگریزائیاں بھی نہیں

ہر سخنِ سادہ لوح نہ دل میں اتر سکا!  
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی نہیں

دنیا کے تذکرے تو طبیعت ہی لے نبھے  
بات اس کی ہو تو پھر سخن آرائیاں بھی نہیں

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے سراز  
دل خود یہ چاہتا تھا کہ رسوائیاں بھی نہیں



جب تری یاد کے جگنو چمکے  
دیر تک آنکھ میں آنسو چمکے

سخت تاریک ہے دل کی دنیا  
ایسے عالم میں اگر تو چمکے

ہم نے دیکھا سرِ بازارِ وفا  
کبھی موتی کبھی آنسو چمکے

شرط ہے شدتِ احساسِ جمال  
رنگ تو رنگ ہے خوشبو چمکے

آنکھ مجبورِ تماشا ہے فنِ راز  
ایک صورت ہے کہ ہر سو چمکے



## مدوح

میں نے کب کی ہے ترے کاکل و لب کی تعریف  
میں نے کب لکھے قصیدے ترے رخساروں کے  
میں نے کب تیرے سراپا کی حکایات کہیں  
میں نے کب شعر کہے جھومتے گلزاروں کے  
جانے دودن کی محبت میں یہ بہکے ہوئے لوگ  
کیسے افسانے بنا لیتے ہیں دلداروں کے



میں کہ شاعر تھا مرے فن کی روایت تھی یہی  
 مجھ کو اک پھول نظر آئے تو گلزار کہوں  
 مسکراتی ہوتی ہر آنکھ کو قاتل جانوں  
 ہر نگاہِ عنسلط انداز کو تلوار کہوں  
 میری فطرت تھی کہ میں حسنِ بیاں کی خاطر  
 ہر حسیں لفظ کو در مدحِ رخ یار کہوں

میرے دل میں بھی کھلے ہیں تری چاہت کے کنول  
 ایسی چاہت کہ جو وحشی ہو تو کیا کیا نہ کرے  
 گر مجھے ہو بھی تو کیا زعمِ طوافِ شعلہ  
 تو ہے وہ شمع کہ پتھر کی بھی پروانہ کرے  
 میں نہیں کہتا کہ تجھ سا ہے نہ مجھ سا کوئی  
 ورنہ شوریدگی شوق تو دیوانہ کرے

کیا یہ کم ہے کہ ترے حسن کی رعنائی سے  
 میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں کہ مہتاب نثار  
 تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی  
 وہ دل آویز صداقت کہ کئی خواب نثار  
 تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشا وہ کسک  
 مرے دشمن مرے قاتل، مرے احباب نثار

میں کسی غم میں بھی رویا ہوں تو میں نے دکھیا  
 تیرے دکھ سے کوئی مجروح نہیں تیرے سوا  
 میرے پیکر میں تری ذات گھٹی ہے اتنی  
 کہ مرا جسم مری روح نہیں تیرے سوا  
 میرا موضوعِ سخن تو ہو کہ ساری دنیا  
 درحقیقت کوئی مدوح نہیں تیرے سوا



پیام آئے ہیں اس یارِ بے وفا کے مجھے  
جسے قرار نہ آیا کہیں بھلا کے مجھے

جدائیاں ہوں تو ایسی کہ عسر بھرنہ ملیں  
فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے

نشتے سے کم تو نہیں یادِ یار کا عالم  
کہ لے اڑا ہے کوئی دوش پر ہوا کے مجھے

میں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے  
اُداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے



تمھارے ہاں سے اب کم نہیں ہے رفعتِ دار  
جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اٹھا کے مجھے

کھینچی ہوئی ہے میرے آنسوؤں میں اک تصویر  
فراز دیکھ رہا ہے وہ مسکرا کے مجھے





بے نیازِ عنیمِ پیمانِ وفا ہو جانا  
تم بھی اوروں کی طرح مجھ سے جدا ہو جانا

میں بھی پلکوں پہ سجالوں گا لہو کی بوندیں  
تم بھی پابستہ زنجیرِ حسنا ہو جانا

گرچہ اب قرب کا امکان ہے بہت کم پھر بھی  
کہیں مل جائیں تو تصویرِ نما ہو جانا

صرف منزل کی طلب ہو تو کہاں ممکن ہے  
دوسروں کے لیے خود آبلہ پا ہو جانا

خلق کی سنگ زنی میری خطاؤں کا صلہ  
تم تو معصوم ہو تم دور ذرا ہو حبانہ

اب مرے واسطے تریاقت ہے الحاد کا زہر  
تم کسی اور پٹجاری کے حسدا ہو جانا



دل میں اب طاقت کہاں خوننا بہ افشانی کرے  
ورنہ غم وہ زہر ہے سہتپس کو بھی پانی کرے

عقل وہ ناصح کہ ہر دم لغزش پا کا خیال  
دل وہ دیوانہ یہی چاہے کہ نادانی کرے

ہاں مجھے بھی ہو گلہ بے مہر می حالات کا  
تجھ کو آزر دہ اگر میری پریشانی کرے

یہ تو اک شہر جنوں ہے چاک ڈاما نو! یہاں  
سب کے سب وحشی ہیں کس کو کون زندانی کرے

موسم گل ہے مگر بے رنگ ہے شاخِ مژہ  
کتنا شرمندہ ہیں آنکھوں کی ویرانی کرے

ہنستے پہروں سے دلوں کے زخم پہچانے کا کون  
تجھ سے بڑھ کر ظلم اپنی خندہ پیشانی کرے

ناصحوں کو کون سمجھائے نہ سمجھے گا فرار  
وہ تو سب کی بات سُن لے اور من بانی کرے





بے سرو ساماں تھے لیکن اتنا اندازہ نہ بھتا  
اس سے پہلے شہر کے گٹنے کا آوازہ نہ تھا

ظرفِ دل دیکھا تو آنکھیں کرب سے پتھر اگئیں  
خون رونے کی تمست کا یہ خمیازہ نہ بھتا

آمرے پہلو میں آئے رونقِ بزمِ خیال  
لذتِ رخسار و لب کا اب تک اندازہ نہ تھا

ہم نے دیکھا ہے خزاں میں بھی ترمی آمد کے بعد  
کو نسا گل تھا کہ گلشن میں تر و تازہ نہ تھا

ہم قصیدہ خواں نہیں اس حسن کے لیکن فراز  
اتنا کہتے ہیں رہیں سرمہ و غازہ نہ تھا



تپتے صحراؤں پہ گرجا سرِ دریا برس  
تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں جا برس

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اک بوند  
دل میں اک لہرا مٹھی آنکھ سے دریا برس

کوئی غرقاب کوئی ماہی بے آب ہوا  
اے بے فیض جو برس بھی تو کیسا برس

چڑھتے دریاؤں میں طوفان اٹھانے والے  
چند بوندیں ہی سرِ دامن صحرا برس

طنز ہیں سوختہ جانوں پہ گرجتے بادل  
یا تو گھنکھو رکھٹائیں نہ اٹھا۔ یا برس

ابر و باراں کے خدا، جھوٹا بادل نہ ہی  
آگ ہی اب سر گلزارِ تمنا برس

اپنی قسمت کہ گھٹاؤں میں بھی جلتے ہیں فراز  
اور جہاں وہ ہیں وہاں ابر کا سایہ برس



افعی کی طرح ڈسنے لگی موجِ نفس بھی  
اے زہرِ عثم یا بہت ہو چکی بس بھی

یہ جس تو جلتی ہوئی رت سے بھی گراں ہے  
اے ٹھہرے ٹھوٹے ابرِ کرم اب تو برس بھی

آئینِ خرابات معطل ہے تو کچھ روز  
اے زبدِ بلا نوش و تہی جامِ ترس بھی

صیاد و نگہبانِ چمن پر ہے یہ روشن  
آباد ہمیں سے ہے نشیمن بھی قفس بھی

محرومیِ حبا وید گنہگار نہ کر دے  
بڑھ جاتی ہے کچھ ضبطِ مسلسل سے ہوس بھی



## اے مرے بیدر دشہر

دل سلگ اٹھتا ہے اپنے بام و در کو دیکھ کر  
 پھیلنے لگتی ہیں جب بھی شام کی پرچھائیاں  
 اس قدر ویران لمحے اس قدر سنسان رُت  
 سوچ میں گم ہیں افق سے تا افق پہنائیاں  
 کس لیے روشن کروں دیوار و در کوئی تو ہو  
 گنگ دیواروں میں کیا ہوں انجمن آرائیاں

دور ہر شب جاگ اُٹھتے ہیں کئی ماہ و نجوم  
 آگ بھڑکاتی ہیں سنگ و خشت کی رعنائیاں  
 راستوں سے خواجگا ہوں تک مسلسل موج رنگ  
 جس طرح قوسِ قزح کی ٹوٹتی انگریزائیاں  
 زخمِ نظر لیے آنکھوں میں چپ تکتا رہا  
 گو مری نیندیں بھی مجھ سے لے اڑی شہنائیاں

کل ذرا سی دیر چمکے تھے مرے دیوار و در  
 جھلملا اُٹھی تھیں میری روح کی گہرائیاں  
 چند لمحوں کے لیے لوٹے اُٹھا تھا اک چراغ  
 اور دمک اُٹھی تھیں کچھ لمحے مرے تنہائیاں  
 آج اتنا شور کیوں ہے اے مرے بید و شہر  
 ہر نظر میری طرف ہے اس قدر رسوائیاں؟



گھر میں کتنا کتنا ہے باہر کتنا شور  
یا دنیا دیوانی ہے یا میرا دل ہے چور

کبھی تو آنکھوں کے گلزاروں میں بھی آکر ناچ  
دل میں کون تجھے دیکھے گا اے جنگل کے مو

یوں پھرتے ہیں گلیوں میں گھبرائے گھبرائے سے  
جیسے اس لستی کے سائے بھی ہوں آدمِ نحر

سوچ کی چنگاری بھڑکا کر کیب نادانی کی  
اُس لمحے سے لیکر اب تک آگ ہے چاروں اور

چاک گریباں پھرناس کو خوش آتا ہے فراز  
ہم بھی اس کو بھول نہ جائیں دل پہ اگر ہوزور





پھر اسی رہ گزار پر شاید  
ہم کبھی مل سکیں مگر شاید

جن کے ہم مندر نظر رہے اُن کو  
مل گئے اور ہم سفر شاید

جان پہچان سے ہم اکسا ہوگا  
پھر بھی اے دوست غور کرنا شاید

اجنبیت کی دھند چھٹ جائے  
چمک اُٹھے تری نظر شاید



زندگی بھر لہو ر لائے گی  
یادِ یارِ ان بے خبر شاید

جو بھی بچھڑے وہ کب ملے ہیں فراز  
پھر بھی تو انتظار کر شاید



اب وہ جھونکے کہاں صبا جیسے  
آگ ہے شہر کی ہوا جیسے

شب سلگتی ہے دوپہر کی طرح  
چاند، سورج سے جل بجھا جیسے

مذتوں بعد بھی یہ عالم ہے  
آج ہی تو حُبُدا ہوا جیسے

اس طرح منزلوں سے ہوں محروم  
میں شریکِ سفر نہ تھا جیسے

اب بھی ویسی ہے دوری منزل  
ساتھ چلتا ہو راستہ جیسے

اتفاقاً بھی زندگی میں فـسـراز  
دوست ملتے نہیں ضیاء جیسے

لہ ضیاء الدین ضیاء

## تریاق

جب تیری اُداس انکھڑیوں میں  
پل بھر کو چمک اُٹھے تھے آنسو  
کیا کیا نہ گزر گئی تھی دل پر  
جب میرے لیے ملول تھی تُو



کہنے کو وہ زندگی کا لمحہ  
 پیمانِ وفا سے کم نہیں بھتا  
 ماضی کی طویل تلخیوں کا  
 جیسے مجھے کوئی غم نہیں تھا  
 تو! میرے لیے اُداس اتنی  
 کیا تھا یہ اگر کرم نہیں بھتا

تو آج بھی میرے سامنے ہے  
 آنکھوں میں اُداسیاں نہ آنسو  
 اک طنز ہے تیری ہر ادا میں  
 چبھتی ہے ترے بدن کی خوشبو  
 یا اب مرے زخم بھر چکے ہیں  
 یا سب مرا زہر پی چکی تو



مستقل محرومیوں پر بھی تو دل مانا نہیں  
لاکھ سمجھایا کہ اُس محفل میں اب جانا نہیں

خود فریبی ہی سہی کیا کیجیے دل کا علاج  
تو نظر پھیرے تو ہم سمجھیں کہ پہچانا نہیں

ایک دنیا منظر ہے اور تیری بزم میں  
اس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا نہیں

جی میں جو آتی ہے کہ گزر و کہیں ایسا نہ ہو  
کل پشیاں ہوں کہ کیوں دل کا کہا مانا نہیں

زندگی پر اس سے بڑھ کر طنز کیا ہو گا فرار  
اُس کا یہ کہنا کہ تو شاعر ہے دیوانہ نہیں



تو پاس بھی ہو تو دل بے قرار اپنا ہے  
 کہ ہم کو تیرا نہیں انتظار اپنا ہے

ملے کوئی بھی ترا ذکر چھیڑ دیتے ہیں  
 کہ جیسے سارا جہاں راز دار اپنا ہے

وہ دُور ہو تو بجا ترکِ دوستی کا خیال  
 وہ سامنے ہو تو کب اختیار اپنا ہے

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا لیا دل سے  
 اس آسِ سرے پہ کہ اک غمگسار اپنا ہے

بلا سے جاں کا زیاں ہو اس اعتماد کی خمیر  
وفا کرے نہ کرے پھر بھی یار اپنا ہے

فرازِ راحتِ جاں بھی وہی ہے کیا کیجے  
وہ جس کے ہاتھ سے سینہ فگار اپنا ہے





جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی  
دیکھا تو وہ تصویر ہر اک دل سے لگی تھی

تنہائی میں روتے ہیں کہ یوں دل کو سکوں ہو  
یہ چوٹ کسی صاحبِ محفل سے لگی تھی

اے دل ترے آشوب نے پھر حشر جگایا  
بے درد ابھی آنکھ بھی مشکل سے لگی تھی

خلقت کا عجب حال تھا اُس کوئے ستم میں  
سائے کی طرح دامنِ قاتل سے لگی تھی

اترا بھی تو کب درد کا چرٹھتا ہوا دریا  
جب کشتی جاں موت کے ساحل سے لگی تھی



کسی کے تذکرے بستی میں کو بکوجو ہوئے  
ہمیں خموش تھے موضوع گفتگو جو ہوئے

نہ دل کا درد ہی کم ہے نہ آنکھ ہی نم ہے  
نہ جانے کون سے ارماں تھے وہ لہو جو ہوئے

نظر اٹھائی تو گم گشتہ تیر تھے!  
ہم آتنے کی طرح تیرے روبرو جو ہوئے

ہمیں ہیں وعدہ فردا پہ ٹالنے والے  
ہمیں نے بات بدل دی بہانہ جو جو ہوئے

فراز ہو کہ وہ سن رہا دہو کہ ہو منصور  
انھیں کا نام ہے ناکام آرزو جو ہوئے

## مجھ سے پہلے

مجھ سے پہلے تجھے جس شخص نے چاہا اس نے  
 شاید اب بھی ترا غم دل سے لگا رکھا ہو  
 ایک بے نام سی اُمید پہ اب بھی شاید  
 اپنے خوابوں کے جزیروں کو سجا رکھا ہو

میں نے مانا کہ وہ بیگانہ پیمانِ وفا  
 کھو چکا ہے جو کسی اور کی رعنائی میں  
 شاید اب لوٹ کے آئے نہ تری محفل میں  
 اور کوئی دکھ نہ رُلانے تجھے تنہائی میں



میں نے مانا کہ شب و روز کے سہنگاموں میں  
 وقت ہر غم کو بھلا دیتا ہے رفتہ رفتہ  
 چاہے امید کی شمعیں سوں کہ یادوں کے چراغ  
 مستقل بعد بجھا دیتا ہے رفتہ رفتہ

پھر بھی ماضی کا خیال آتا ہے گاہے گاہے  
 مڈتیں درد کی لو کم تو نہیں کر سکتیں  
 زخم بھر جائیں مگر داغ تو رہ جاتا ہے  
 دُوریوں سے کبھی یادیں تو نہیں مرسکتیں

یہ بھی ممکن ہے کہ اک دن وہ پشیمان ہو کر  
 تیرے پاس آئے زمانے سے کنارہ کر لے  
 تو کہ معصوم بھی بنے زود فراموش بھی ہے  
 اُس کی پیمائش کنی کو بھی گوارا کر لے



اور میں، جس نے تجھے اپنا میسج سمجھا  
ایک زخم اور بھی پہلے کی طرح سہہ جاؤں  
جس پہ پہلے بھی کئی عہدِ وفا ٹوٹے ہیں  
اسی دور ہے یہ چپ چاپ کھڑا رہ جاؤں



کروں نہ یاد، مگر کس طرح بھلاؤں اُسے  
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اُسے

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند  
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اُسے

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے  
میں کیسے بات کروں اب کہاں سے لاؤں اُسے

مگر وہ زود فراموش، زود رنج بھی ہے  
کہ روٹھ جائے، اگر یاد کچھ دلاؤں اُسے

وہی جو دولتِ دل ہے وہی جو راحتِ جاں  
تمہاری بات پہ اے ناصحو، گنواؤں اُسے

جو ہم سفرِ سیرِ منزلِ پچھڑا رہا ہے فراز  
عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اُسے



اب اور کیا کسی سے مراسم بڑھائیں ہم  
یہ بھی بہت ہے تجھ کو اگر بھول جائیں ہم

صحرائے زندگی میں کوئی دوسرا نہ تھا  
سنستے رہے ہیں آپ ہی اپنی صدائیں ہم

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب  
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

تو اتنی دل زدہ تو نہ تھی اے شبِ فراق  
آبِ ترے راستے میں ستارے کٹائیں ہم

وہ لوگ اب کہاں ہیں جو کہتے تھے کل فرار  
ہے خدا نہ کر وہ تجھے بھی رُلائیں ہم





اُتری تھی شہرِ گل میں کوئی آتشیں کرن  
وہ روشنی ہوئی کہ سلگنے لگے بدن

غارت گرِ چمن سے عقیدت تھی کس قدر  
شاخوں نے خود اتار دیے اپنے پیرین

اس انتہائے قرب نے دھندلا دیا تجھے  
کچھ دُور ہو کہ دیکھ سکوں تیرا بانگِ پین

میں بھی تو کھو چلا تھا زمانے کے شور میں  
یہ اتفاق ہے کہ وہ یاد آگئے معاً

جس کے طفیل مہرِ بلب ہم رہے فراز  
اُس کے قصیدہ خواں ہیں سبھی اہلِ سخن

## کوئی بھٹکتا بادل

دُور اک شہر سے جب کوئی بھٹکتا بادل  
میری جلتی ہوئی بستی کی طرف آئے گا  
کتنی حسرت سے اسے دیکھیں گی پیاسی آنکھیں  
اور وہ وقت کی مانند گزر جائے گا

جانے کس سوچ میں کھو جائے گی دل کی دُنیا  
جانے کیا کیا مجھے بدیتا ہو یا یاد آئے گا  
اور اُس شہر کا بے فیض بھٹکتا بادل  
درد کی آگ کو پھیلا کے چلا جائے گا



کیسی طلب اور کیا اندازے مشکل ہے تقدیر بنے  
 دل پر جس کا ہاتھ بھی رکھیو آخر وہ شمشیر بنے  
 غم کے رشتے بھی نازک تھے تم آئے اور ٹوٹ گئے  
 دل سا وحشی اب کیا سنبھلے اب کیا شے زنجیر بنے

اپنا لہو تیری رحمت آئی تاریکی اس دنیا کی  
 میں نے کیا کیا رنگ چُھنے ہیں دیکھوں کیا تصویر بنے

اپنا یہ عالم ہے خود سے بھی اپنے زخم چھپاتے ہیں  
 لوگوں کو یہ فن کر کہ کوئی موضوعِ تشہیر بنے

تم نے فرار اس عشق میں سب کچھ کھو کر بھی کیا پایا ہے  
 وہ بھی تو ناکامِ وفا تھے جو غالب اور میر بنے





اپنی محبت کے افسانے کب تک راز بناؤ گے  
رسوائی سے ڈرنے والو بات تمہیں پھیلاؤ گے

اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت  
ترکِ محبت کرنے والو! تم تنہا جاؤ گے

بہر کے ماروں کی خوش فہمی! جاگ رہے ہیں پیروں سے  
جیسے یوں شب کٹ جائے گی جیسے تم آ جاؤ گے

زخمِ نمناک کا بھر جانا گویا جان سے جانا ہے  
اُس کا بھلانا سہل نہیں ہے خود کو بھی یاد آؤ گے



چھوڑو عہد وفا کی باتیں کیوں جھوٹے اقرار کریں  
کل میں بھی شرمندہ ہوں گا کل تم بھی پھپھیاؤ گے

رہنے دو یہ پند و نصیحت ہم بھی فراز سے وقف ہیں  
جس نے خود سوزِ خم سے ہوں اُس کو کیا سمجھاؤ گے

## زندگی ! اے زندگی

میں بھی چپ ہو جاؤں گا بھرتی ہوئی شمعوں کے ساتھ  
 اور کچھ لمحے ٹھہرا! اے زندگی! اے زندگی  
 جب تک روشن ہیں آنکھوں کے فسردہ طاقے  
 نیلگوں ہونٹوں سے پھوٹے گی صدا کی روشنی  
 جسم کی گرتی ہوئی دیوار کو تھامے ہوئے  
 موم کے بُت آتشیں چہرے سُکھتی مورتیں  
 میری بنیائی کی یہ مخلوق زندہ ہے ابھی  
 اور کچھ لمحے ٹھہرا! اے زندگی! اے زندگی

ہو تو جانے دے مرے لفظوں کو معنی سے تہی  
 میری تحریریں دھوئیں کی رنگیتی پر چھائیاں  
 جن کے پیکر اپنی آوازوں سے خالی بے لہو!  
 محو ہو جانے تو دے یادوں کے خوابوں کی طرح  
 رُک تو جائیں آخری سانسوں کی وحشی اندھیاں  
 پھر سٹالینا مرے ماتھے سے تو بھی اپنا ہاتھ  
 میں بھی چُپ ہو جاؤں گا بھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ  
 اور کچھ ملے کھٹے! اے زندگی! اے زندگی





چند لمحوں کے لیے تو نے مسیحائی کی  
پھر وہی میں ہوں وہی عمر ہے تنہائی کی

کس پہ گزری نہ شبِ ہجر قیامت کی طرح  
فرق اتنا ہے کہ ہم نے سخن آرائی کی

اپنی بانہوں میں سمٹ آئی ہے وہ قوسِ قزح  
لوگ تصویر ہی کھینچا کیے انگریزی کی

غیرتِ عشقِ حجاب، طعنہٴ پاراں تسلیم  
بات کرتے ہیں مگر سب اسی ہر جاہلی کی

اُن کو بھولے ہیں تو کچھ اور پریشاں ہیں فراز  
اپنی دانست ہیں دل نے بڑی دانائی کی





رغم ایسا کیا کہ لطفِ دوست ٹھکرا نا پڑے  
یہ طبیعت ہے تو شاید جاں سے بھی جانا پڑے

خانہ ویرانی تو ہوتی ہے مگر ایسی کہاں  
اپنی آنکھوں سے خود اپنا گھر نہ پہچانا پڑے

رسم چل نکلی عجب اب میکدے کی خیر ہو  
ہے وہی جمشید جس کے ہاتھ پہچانہ پڑے

سوچ لو اس بزم سے اٹھنے سے پہلے سوچ لو  
یہ نہ ہو پھر دل کے ہاتھوں لوٹ کر آنا پڑے

لے چلے ہیں حضرتِ ناصح مجھے جس راہ سے  
لطف جب آئے اُدھر بھی کوئے جانانہ پڑے

غم ہی ایسا تھا کہ دل شوق ہو گیا ورنہ فشر از  
کیسے کیسے حادثے نہیں نہیں کے سہہ جانا پڑے



اب نہ فرصت کی نہ احساس ہے غم سے اپنے  
ور نہ ہم روز ہی ملتے تھے صنم سے اپنے

دل نہ مانا کہ کسی اور کے رستے پہ چلیں  
لاکھ گمراہ ہوئے نقش قدم سے اپنے

جی چکے ہم جو یہی شوق کی رسوائی ہے  
تم سے بریگانے ہوئے جاتے ہیں ہم سے اپنے

ہم نہیں پھر بھی تو آباد ہے محفل اُن کی  
ہم سمجھتے تھے کہ رونق ہے تو ہم سے اپنے

میرے امن کے مقدر میں ہے خالی رہنا  
آپ شرمندہ نہ ہوں دستِ کرم سے اپنے

رہ چکے مرگِ تمنا پہ بھی اک عمر سراز  
اب جو زندہ ہیں تو شعروں کے بھرم سے اپنے



یہ تو جب ممکن ہے.....

پھر چلے آئے ہیں ہمدِ لے کے ہمدِ دی کے نام  
 آہوئے رَمِ خورِ وہ کی وحشت بڑھانے کے لیے  
 میرے دل سے تیری چاہت کو مٹانے کے لیے

چھیڑ کر افسانہ ناکامی اہلِ وف  
 تیری مجبوری کے قصے میری بربادی کی بات  
 اپنی اپنی سرگزشتیں دوسروں کے تجربات

اُن کو کیا معلوم لیکن تیری چاہت کے کرم  
میری تنہائی کے دوزخ میری جنت کے بھرم  
تیری آنکھوں کا دفن آمیز افسردہ خیال

کاش اتنا سوچ سکتے غم گساروں کے داغ  
یہ تو جب ممکن ہے تجھ جائے ہر آنسو ہر چراغ  
خود کو ان میں دفن کر دوں بھول جاؤں اپنا نام



تم بھی خفا ہو لوگ بھی برہم ہیں دوستو  
اب ہو چلا یقیں کہ بڑے ہم ہیں دوستو

کس کو ہمارے حال سے نسبت کیا کہیں  
آنکھیں تو دشمنوں کی بھی پرہم ہیں دوستو

اپنے سوا ہمارے نہ ہونے کا غم کسے  
اپنی تلاش میں تو ہمیں ہم ہیں دوستو

کچھ آج شام ہی سے ہے دل بھی گھباجھبا  
کچھ شہر کے چراغ بھی مدہم ہیں دوستو

اس شہر آرزو سے بھی باہر نکل چلو  
اب دل کی رونقیں بھی کوئی دم ہیں دوستو

سب کچھ سہی و سراز پر اتنا ضرور ہے  
دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں دوستو





تو کہاں تھا زندگی کے روز و شب آنکھوں میں تھے  
 آج یاد آیا کہ آنسو بے سبب آنکھوں میں تھے

رات بھرتاروں کی صورت جاگتے رہنا، ہمیں  
 صبح دم ہنا کہ کیا کیا خوابِ شب آنکھوں میں تھے

تیری یادوں کی مہک ہر درد کو بسرا گئی  
 ورنہ تیرے دکھ بھی اے شہرِ طرب آنکھوں میں تھے

اب تلک جن کی جدائی کا قلق جی کو نہ تھا  
 آج تو بچھڑا تو وہ بھی سب کے سب آنکھوں میں تھے

اب تو ضبطِ غم نے پتھر کر دیا ورنہ سراز  
 دیکھتا کوئی کہ دل کے زخم جب آنکھوں میں تھے



لمحے و فورِ شوق کے ایسے نہ آئے تھے  
یوں چُپ ہیں تیرے پاس ہی جیسے نہ آئے تھے

ساتی شکستِ جام سے چہروں پہ دکھینا  
وہ رنگ بھی کہ شعلہ مے سے نہ آئے تھے

دل پر لگی خراش تو چہرے شفق ہوئے  
اب تک تو زخمِ راس کچھ ایسے نہ آئے تھے

پہلے بھی روئے ہیں مگر اب کے وہ کرب ہے  
آنسو کبھی بھی آنکھوں میں جیسے نہ آئے تھے

جب صبح ہو چکی ہے تو کیا سوچنا سزا  
وہ رات کیوں نہ آئے تھے کیسے نہ آئے تھے



اسی خیال میں تاروں کو رات بھر دیکھوں  
کہ تجھ کو صبح قیامت سے پشتِ تری دیکھوں

اس اک چراغ کی لوچھڑی ہی ہے آنکھوں میں  
تمام شہر ہو روشن تو اپنا گھر دیکھوں

مجھے خود اپنی طبیعت پہ اعتماد نہیں  
خدا کرے کہ تجھے اب نہ عمر بھر دیکھوں

صدائے غولِ سیاہاں نہ ہو یہ آوازہ  
مرا وجود ہے پتھر جو لوٹ کر دیکھوں



نظر عذاب ہے پاؤں میں ہو اگر زنجیر  
فضا کے رنگ کو دیکھوں کہ بال و پردیکھوں

جدا سہی مری منزل بچھڑ نہیں سکتا!  
میں کس طرح تجھے اوروں کا ہمسفر دیکھوں

وہ لب فراز اگر کر سکیں میجانی  
بقولِ درد میں سو سو طرح سے مردیکھوں





(بطورِ زبیدال)

جبشِ مژگاں کہ ہر دمِ دل کشائے زخم ہے  
جو نظر اٹھتی ہے گویا آتشائے زخم ہے

دیکھنا آئینِ مقتل، دلفگارِ ان و فنا  
التفاتِ تیغِ قاتلِ خوں بہائے زخم ہے

بسکہ جوڑِ فصلِ گل سے کھل گئے سینوں کے چاک  
خندہِ گل بھی ہم آہنگِ صدائے زخم ہے

ہم نفس! ہر آستیں میں دشنہ پنہاں ہے تو کیسا  
ہم کو پاسِ خاطرِ یاراں بجائے زخم ہے

آماشا کر کبھی اے بے نیازِ شامِ غم  
 دیدہ بے خواب بھی چاکِ قبائے زخم ہے

کس سے جز دیوارِ مژگانِ سیلِ دردِ دلِ رُکے  
 سائلِ دریائے خوں لبِ آشنائے زخم ہے

ضبطِ گریہ، چشمِ خوں بستہ کو تھا عقدہ کشا  
 رہ گیا تھا دل میں جو آنسو بنائے زخم ہے

شعلہٴ افسردگی ہے شمعِ فانوسِ خیال  
 داغ کیا ہے دل سے پیمانِ وفائے زخم ہے

اب تو دامنِ تک پہنچ آیا سرِ چاکِ جنوں  
 ہم تو سمجھے تھے کہ بس دلِ انتہائے زخم ہے

سلسلہ ہائے طلب سے رستگاری ہے کسے!  
 دلِ ہلاکِ ناوک و ناوک فدائے زخم ہے

چارہ کرنے بہرِ تسکین رکھ دیا ہے دل پہ ہاتھ  
مہرباں ہے وہ مگر نا آشنائے زخم ہے

میری وحشت کب ہوئی رسوائے عرمانی فراز  
کل بدن پر سپرین تھا اب رسوائے زخم ہے



## المیہ

کس تمنا سے یہ چاہا تھا کہ اک روز تجھے  
ساتھ اپنے لیے اس شہر کو جاؤں گا جسے  
مجھ کو چھوڑے ہوئے بھولے ہوئے اک عمر ہوئی

ہائے وہ شہر کہ جو میرا وطن ہے پھر بھی  
اُس کی مانوس فضاؤں سے رہا بیگانہ  
میرادل میرے خیالوں کی طرح دیوانہ

آج حالات کا یہ طنزِ حُبِ گرسوز تو دیکھ  
تو مرے شہر کے اک حبلہ زریں میں مکین  
اور میں پردیس میں جاں دادہ یک نایں جو ہیں





مندظر کب سے تخیّر ہے تری تفت دیر کا  
بات کرنا تجھ پر گمساں ہونے لگا تصویر کا

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نمین در اُٹکئی  
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

کیسے پایا تھا تجھے پھر کس طرح کھویا تجھے  
مجھ سا مسکر بھی تو قائل ہو گیا تفت دیر کا

جس طرح بادل کا سایہ پائیں بھڑکاتا رہے  
میں نے یہ عالم بھی دیکھا ہے تری تصویر کا

جانے کس عالم میں تو بچھڑا کہ ہے تیرے بغیر  
آج تک ہر نقش فریادی مری تحریر کا

عشق میں سر پھوڑنا بھی کیا کہ یہ بے مہر لوگ  
جوئے خوں کو نام دے دیتے ہیں جوئے شیر کا

جس کو بھی چاہا اُسے شدت سے چاہا ہے فراز  
سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا

## تمثیل

کتنی صدیوں کے انتظار کے بعد  
 قربتِ یک نفس نصیب ہوئی  
 پھر بھی تو چُپ، اداس، کم آئینز

اے سُگتے ہوئے چراغِ بھڑک  
 درد کی روشنی کو چاند بن  
 کہ ابھی آنکھوں کا شور ہے تیز

ایک پل مرگِ جاوداں کا صلہ  
 اجنبیت کے زہر میں مت گھول  
 مجھ کو مت دیکھ لیکن آنکھ تو کھول



آنکھوں میں چُھبے ہے ہیں دروہام کے چراغ  
جب دل ہی بچھ گیا ہو تو کس کام کے چراغ

کیا شام تھی کہ جب تے آنے کی آس تھی  
اب تک جلا رہے ہیں تے نام کے چراغ

شاید کبھی یہ عرصہ یک شب نہ کٹ سکے  
تو صبح کی ہوا ہے تو ہم شام کے چراغ

اس تیرگی میں لغزشِ پابھی ہے خودکشی  
اے رہ نورِ دِشوق ذرا تھام کے چراغ



ہم کیا سمجھے کہ جاتی رہی یاد رفتگاں  
شاید ہمیں تھے گردشِ ایام کے چراغ

ہم درخورِ ہوائے ستم بھی نہیں فرار  
جیسے مزار پر کسی گھٹنِ مہم کے چراغ

نظر کی دھوپ میں سائے گھلے ہیں شب کی طرح  
میں کب اور اس نہیں تھا مگر نہ اب کی طرح

پھر آج شہرِ تمنا کی رہزاروں سے!  
گزر رہے ہیں کئی لوگ روز و شب کی طرح

تجھے تو میں نے بڑی آرزو سے چاہا تھا  
یہ کیا کہ چھوڑ چلا تو بھی اور سب کی طرح

فسردگی ہے مگر وجہِ غم نہیں معلوم  
کہ دل پہ بوجھ سا ہے رنج بے سبب کی طرح

کھلے تو اب کے بھی گلشن میں پھول ہیں لیکن  
نہ میرے زخم کی صورت نہ تیرے لب کی طرح



ہم کیا کہ اسی سوچ میں بادِ چسپنی تھی  
وہ گل کی چٹکائی تھی کہ تری کلمِ سخنِ تھی

آنسو کی وہ اک بوند جو آنکھوں سے نہ پھلی  
آئینہٴ دل کے لیے ہیرے کی کنی تھی

پیمانے کو ہم منہ سے لگاتے نہ لگاتے  
ساتی کی ملاقات ہی تو بہ شکنی تھی

اب صورتِ دیوار ہیں چپ چاپ کہ تجھ سے  
کچھ اور تعلق نہ سہی ہم سخنِ تھی

یہ جاں جو کڑی دھوپ میں جلتی رہی برسوں  
اوروں کے نیے سایہ دیوار بنی تھی

دنیا سے بچھڑتے کہ فرازان کو بھلاتے  
ہر حال میں اپنے لیے پیمیاں شکنی تھی



## نیند

سرد پلکوں کی صلیبوں سے اتارے ہوئے خواب  
 ریزہ ریزہ ہیں مرے سامنے شیشوں کی طرح  
 جن کے ٹکڑوں کی چھین جن کی خراشوں کی حلبن  
 عمر بھر جاگتے رہنے کی سزا دیتی ہے  
 شدتِ کرب سے دیوانہ بنا دیتی ہے

آج اس قرب کے ہنگام وہ احساس کہاں  
 دل میں وہ درد نہ آنکھوں میں چراغوں کا دھواں  
 اور صلیبوں سے اتارے ہوئے خوابوں کی مثال  
 جسم گرتی ہوئی دیوار کی مانسند نڈھال  
 تو مرے پاس سہی اے مرے آرزوہ جمال

## خوشبو کا سفر

چھوڑ پیمانِ وفا کی بات شرمندہ نہ کر  
دُوریاں، مجبوریاں، رسوائیاں، تنہائیاں  
کوئی قاتل، کوئی بسمل، سسکیاں، شہنائیاں،  
دیکھ یہ سنہتا ہو اموکم ہے موضوعِ فلسفہ

وقت کی رو میں ابھی ساحل ابھی موجِ فنا  
 ایک جھونکا ایک آندھی، اک کرن، اک جھڑنے جوں  
 پھر وہی صحر اکا سناٹا وہی مرگِ جنوں  
 ہاتھ ہاتھوں کا اٹانہ، ہاتھ ہاتھوں سے جُدا

جب کبھی آئے گا ہم پر بھی جُدائی کا سماں  
 ٹوٹ جائے گا مرے دل میں کسی خواہش کا تیر  
 بھیگ جائے گی تری آنکھوں میں کاجل کی لکیر

کل کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزرہ نہ کر  
 دیکھ یہ منہتا، ہوا موسم یہ خوشبو کا سفر





تجھے ادا اس کیا خود بھی سو گوار ہوئے  
ہم آپ اپنی محبت سے شرمسار ہوئے

بلا کی رو تھی، ندیمانِ آبلہ پا کو!  
پلٹ کے دیکھنا چاہا کہ خود غبار ہوئے

گلہ اسی کا کیا جس سے تجھ پہ حرف آیا  
وگر نہ یوں تو ستم ہم پہ بے شمار ہوئے

یہ انتقام بھی لینا تھا زندگی کو ابھی  
جو لوگ دشمن جاں تھے وہ غمگسار ہوئے

ہزار بار کیا ترکِ دوستی کا خیال  
مگر فرازِ پشیمان ہر ایک بار ہوئے



## .... اُن دیکھے دیاروں کے سفیر

اور جب ہوگا ترازو ہجر کے ترکش کا تیر  
 مختلف ہوں گے تو کتنے دوسرے لوگوں سے ہم  
 جو چلے تھے کوچہ جاناں سے مقتل کی طرف  
 بے نیازِ سنگِ خلقت، بے غمِ تیغِ ستم  
 اپنے اپنے شوقِ بے پروا کی بارائیں لیے  
 دردِ وارفتہ کی شمعوں کو جلانے ہر قدم  
 اُن میں ہر اک با وفا، ثابت قدم، زندہ ضمیر

اُن کی آنکھیں ریزہ ریزہ اُن کی جانیں زخم زخم  
 اُن کے آنسو کا بیج کے تابوتِ ریشم کے کفن  
 اُن میں خوابیدہ کسی لیلہ کسی شیریں کا خواب  
 اُن میں آسودہ جنونِ قیس و خونِ کوہسکن  
 اُن کے ہاتھوں پر شکستوں کے نشاں ضربِ عدو  
 اُن کے ہاتھوں کی لکیروں میں جو انمروں کا فن  
 اُن میں ہر اک تھا کسی دایمِ تمنا کا اسیر

اُن پہ جو گزری وہ گزے گی ہر اہلِ درد پر  
 اور ہم دونوں بھی اپنے جرم سے غافل نہیں  
 تیری پیشانی کی سچ دھج میری چاہت کا غرور  
 گو یہ وہ زندہ ہیں جو شرمندہ قاتل نہیں  
 پھر تھی کس دامنِ دریدہ کو یہاں بخشش ملی  
 اس سفر میں راستوں کے زخم ہیں منزل نہیں  
 اور ہم دونوں ہیں اُن دیکھے دیاروں کے سفیر



اب کے ہم کچھ پڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں  
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈا جڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی  
یہ خزانے تجھے ممکن ہے حشر ابوں میں ملیں

غم دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو  
نشہ بڑھتا ہے شراب میں جو شرابوں میں ملیں

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا!  
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر  
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ ہیں نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فراز  
جیسے دو شخص تمنا کے سرابوں میں ملیں





اچھا تھا اگر زخم نہ بھرتے کوئی دن اور  
اُس کوئے ملامت میں گزرتے کوئی دن اور

راتوں کو تری یادوں کے خورشید اُبھرتے  
آنکھوں میں ستارے سے اُترتے کوئی دن اور

ہم نے تجھے دیکھا تو کسی کو بھی نہ دیکھا  
اے کاش ترے بعد گزرتے کوئی دن اور

راحت تھی بہت رنج میں ہم غم طلبوں کو  
تم اور بگڑتے تو سنورتے کوئی دن اور

گو ترکِ تعلق تھا مگر جہاں پہ سنبی تھی!  
مرتے جو تجھے یاد نہ کرتے کوئی دن اور

اس شہرِ منّا سے فرار آئے ہی کیوں تھے  
یہ حال اگر تھا تو ٹھہرتے کوئی دن اور



ترس رہا ہوں مگر تو نطن نہ آ مجھ کو  
کہ خود جدا ہے تو مجھ سے نہ کر جدا مجھ کو

وہ کپکپاتے ہوئے ہونٹ میرے شانے پر  
وہ خواب سانپ کی مانند ڈس گیا مجھ کو

چٹخ اٹھا ہوں سلگتی چٹان کی صورت  
پکارا اب تو مرے دیر آشنا مجھ کو!

تجھے تراش کے میں سخت منفعیل ہوں کہ لوگ  
تجھے صنم تو سمجھنے لگے حسدا مجھ کو

یہ اور بات کہ اکثر دمک اٹھا چہرہ  
کبھی کبھی یہی شعلہ بجھا گیا مجھ کو

یہ قربتیں ہی تو وجہ سراق ٹھہری ہیں  
بہت عزیز ہیں یاران بے وفا مجھ کو

ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں  
وہ ایک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

اُسے فراز اگر دکھ نہ بھتا بچھڑنے کا  
تو کیوں وہ دور تک دیکھتا رہا مجھ کو



## میں اور تو

روز جب دھوپ پہاڑوں سے اترنے لگتی  
 کوئی گھٹنا ہوا بڑھنا ہوا بیکل سایہ  
 ایک دیوار سے کہتا کہ مرے ساتھ چلو

اور زنجیرِ رفاقت سے گریزاں دیوار  
 اپنے پندار کے نشے میں سدا استادہ  
 خواہش ہمدمِ دیرینہ پہ منس دیتی تھی

کون دیوار کسی سائے کے ہمراہ چلی  
کون دیوار ہمیشہ مگر استادہ رہی  
وقت دیوار کا ساتھی ہے نہ سائے کا رفیق

اور اب سنگ و گل و خشت کیے بلے کے تلے  
اُسی دیوار کا پندار ہے ریزہ ریزہ  
دھوپ نکلی ہے مگر جانے کہاں ہے سایہ



کون آتا ہے مگر اُس لگائے رکھنا  
عمر بھر درد کی شمعوں کو جلائے رکھنا

دوست پریش پیمصر اور ہمارا شیوہ  
اپنے احوال کو خود سے بھی چھپائے رکھنا

ہم کو اُس نام نے مارا کہ جہاں بھی جاتیں  
خلقتِ شہر نے طوفان اٹھائے رکھنا

اِس چپکا چوند میں آنکھیں بھی گنوا بیٹھو گے  
اُس کے ہوتے ہوئے پلکوں کو جھبکائے رکھنا



میں کہ پُرتھور سمندر تھے مرے پاؤں میں  
اب کہ ڈوبا ہوں تو سوکھے ہوئے دریاؤں میں

نامرادی کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں  
تو بھی شامل تھا کبھی میری تمناؤں میں

دن کے ڈھلتے ہی اُجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے  
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں

چاکِ دل سی کہ نہ سی، زخم کی توہین نہ کر!  
ایسے قاتل تو نہ تھے میرے مسیحاؤں میں

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فنراز  
گھنٹیاں بجاتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں